تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

اکتوبر ۲۰۲۱ء

جلد ۱

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۱۱

ليتفقهوا في الدين

فقہ اکیڈمی

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
اقبال

ليتفقهوا في الدين

ماہ نامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ
حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر
صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر
حافظ حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت
- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- حافظ سید اسامہ علی
- استاذ ابرار حسین
- استاذ عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

نعت	صبا بسوئے مدینہ روکن	حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ	۴
اداریہ	قبولِ اسلام	مدیر	۶
درسِ قرآن	عبادت اور تقویٰ کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ	مولانا محمد اقبال	۱۰
درسِ حدیث	تعلیم و تعلم سے بے رغبتی کی مذمت	ابنِ عباس	۱۵
مقالات	فہمِ قرآن کے دو رجحان	محمد بلال احمد/صوفی جمیل الرحمٰن عباسی	۱۸
	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۴)	صوفی جمیل الرحمن عباسی	۳۰
یسئلونک	محفلِ میلاد کا انعقاد	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۰
ادبیات	انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا	محمد حسین آزاد	۴۲

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۳۸-۱۳۲۵)

سلسلۂ چشتیہ کے معروف صوفی بزرگ

صبا بہ سوے مدینہ رو کن

صبا بسوئے مدینہ رو کن، از ایں دعا گو سلام بر خواں
بہ گردِ شاہِ مدینہ گرد و بصد تضرُع پیام بر خواں

اے بادِ صبا! مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو جاؤ، اور وہاں اس دعا گو کی طرف سے سلام عرض کرو، شاہِ مدینہ کے گرد طواف کرتے ہوئے، بے حد عاجزی سے یہ پیغام عرض کرو۔

بشو ز من صورتِ مثالی، نماز بگذار اندر آنجا
بہ لحنِ خوش سورۂ محمد تمام اندر قیام بر خواں

ہو بہو میری مثل صورت و سراپا ہو کر وہاں نماز ادا کرو، (اور) دورانِ قیام خوش الحانی کے ساتھ سورۂ محمد کی قراءت کرو۔

بہ بابِ رحمت گہے گزر کُن، ببابِ جبریلؑ گہ جبیں سا
سلامِ ربی علیٰ نبیؐ، گہے ببابِ سلام بر خواں

کبھی بابِ رحمت سے گزرو، اور کبھی بابِ جبرئیل پہ ماتھا ٹیکو، کبھی بابِ سلام پر نبی کریم ﷺ پہ میرے رب کا سلام عرض کرو۔

بنہ بہ چندیں ادب طرازی، سرِ ارادت بخاک آں کو
صلوٰۃِ وافر بروحِ پاکِ جنابِ خیرُ الانام بر خواں

ادب طرازی کی حدود کی پابندی کرتے ہوئے، اس کوچے کی خاک پہ عقیدت سے سر رکھ کر، جنابِ خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس روح کی بارگاہ میں، بے شمار و بے حساب درود و سلام عرض کرو۔

بہ لحنِ داؤدؑ ہم نوا شو، بہ نالہ و درد آشنا شو
بہ بزم پیغمبرِ ایں غزل را، ز عبدِ عاجز نظاؔم بر خواں

لحنِ داؤد کی ہمنوا ہو کر، نالہِ درد سے آشنا ہو کر پیغمبر علیہ السلام کی بزم میں اس عاجز بندے نظاؔم کا یہ کلام عرض کرو۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

* * * * *

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

قبولِ اسلام

یہودی لڑکا شدید بیمار تھا۔ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ کبھی وضو کے لیے پانی لادیتا۔ کبھی جوتے سیدھے کردیتا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی بیماری کی اطلاع ملی تو آپ عیادت کو تشریف لے آئے۔ تیمار داری کے بعد آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی اور فرمایا: ”پڑھو لا الہ الا اللہ“۔ بچہ خاموش رہا اور اس نے اپنے والد کی طرف دیکھا، وہ بھی خاموش تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ ارشاد فرمایا: ”اے بچے! کلمۂ طیبہ ادا کرو“۔ بچہ شش و پنج کا شکار تھا۔ اس نے پھر اپنے والد کی طرف دیکھا۔ باپ نے کہا: ”بیٹا ابوالقاسم کی بات مان لو“۔ پس لڑکے نے کہا: «أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللهِ» ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں“۔ نبی کریم ﷺ وہاں سے نکلے اور آپ ﷺ فرمارہے تھے: «اَلْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَخْرَجَهُ بِي مِنَ النَّارِ» ”اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے ذریعے سے اس بچے کو دوزخ سے بچالیا“۔ (صحیح بخاری، مُسندِ احمد) مکے میں جب نبی کریم ﷺ نے توحید کی شمع روشن کی تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ چھوٹے سے بچے تھے۔ ان کے بارے میں آتا ہے: «أَسْلَمَ عَلِيٌّ وَهُوَ غُلَامٌ ابْنُ ثَمَانِ سِنِينَ» (سنن ترمذی) ”حضرت علی اسلام لائے جب کہ ان کی عمر آٹھ سال تھی“۔ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابنِ صیاد کو اسلام کی دعوت دی جب کہ ابھی وہ نابالغ تھا۔ اسی طرح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے چھوٹی عمر ہی میں اسلام قبول کیا۔ علماے امت کا یہ متفقہ موقف ہے کہ نابالغ اگر اسلام میں داخل ہوجائے تو قانونی

اور اخلاقی ہر اعتبار سے مسلمان شمار ہو گا اور اس پر شریعت کے احکام لاگو ہوں گے۔ اسلام کی تاریخ کے کسی بھی موڑ پر یہ نہیں ہوا کہ کسی کے اسلام کو اس کی کم عمری کی وجہ سے رد کر دیا گیا ہو۔ لیکن بد قسمتی سے اسلام کے نام پر بننے والے ملک پاکستان میں یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ کسی طرح کم عمری کے اسلام پر پابندی لگا دی جائے۔ اس کے لیے اقلیتوں کے تحفظ کے قانون کی آڑ میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام لانے کی کم از کم عمر اٹھارہ سال مقرر کر دی جائے۔ اس مہم میں بعض ہندو اراکین اسمبلی اور کئی ایک این جی اوز شامل ہیں۔ البتہ اس قانون سازی کا داعیہ داخلی نہیں بلکہ خارجی ہے۔ مغرب کے بے ہودہ نظامِ معاشرت کے داعی ممالک کی طرف سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مشرق کے لوگوں کے سماج کو اپنے ڈھب پر لایا جائے۔ ان لوگوں کی مکمل سرگرمیوں کو سامنے لانے کے لیے تو کسی تفصیلی تحقیق کی ضرورت ہے۔ بطورِ مثال ہم اس آن لائن مکالمے کا ذکر کرتے ہیں جو واشنگٹن ڈی سی کے ایک تھنک ٹینک ہڈسن انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے چند ماہ قبل منعقد ہوا۔ اس ویبی نار میں پاکستان کی سابق رکنِ قومی اسمبلی اور امریکہ میں Religious Freedom Institute کی سینیر فیلو فرح ناز اصفہانی، ریڈیو فری ایشیا، ریڈیو مشال کے سینیر ایڈیٹر داود خٹک، ہندو امریکن فاؤنڈیشن میں ہیومن رائٹس کی ڈائریکٹر دیپالی کلکرنی، ہڈسن انسٹی ٹیوٹ کے Centre for Religious Freedom کی ڈائریکٹر نینا شیے نے مقررین کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروگرام کی میزبانی اپرنا پانڈے نے کی جو ہڈسن انسٹی ٹیوٹ میں ہی Initiative on Future of India and South Asia کی ڈائریکٹر ہیں۔ اس ویبی نار کے درج ذیل مطالبے سامنے آئے تھے۔ حکومتِ پاکستان اس بات کو یقینی بنائے کہ آبادی کے کسی بھی اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے والی بچی کی اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے نہ تو شادی کی جا سکے اور نہ ہی اس کا مذہب تبدیل کیا جا سکے۔ امریکہ کو چاہیے کہ وہ پاکستان کی حکومت کے لیے امداد کو مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کی بہتری سے مشروط کرے۔ پاکستان میں تبدیلیٔ مذہب کے مراکز اور اس میں ملوث شخصیات پر سفری اور معاشی پابندیاں عائد کی جائیں۔ ان لوگوں نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ اس معاملے میں بتدریج تبدیلی کا انتظار کرنے کے بجائے قانون کی نظر سے اس کو دیکھا اور نمٹا جائے گا‘‘۔

(www.urduvoa.com/a/hudson-institute-webinar-on-forced-hindu-marriages-in-pakistan/5878077.html)

ان شیطانوں کے پاکستانی دوستوں نے چند ہی ماہ میں قانون سازی کی راہ ہموار کرلی تھی، وہ تو بھلا ہو سینیٹر مشتاق احمد صاحب کا جنھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کے بعد کئی نیک دل صحافی بھی اس مہم میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل نے اس قانون کو غیر اسلامی قرار دے دیا۔ ہم ان تمام حضرات اور اداروں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اسلام کا راستہ روکنے کی اس مذموم کوشش کا ناکام بنایا۔ اس قانون سازی کے لیے بہانہ یہ بنایا گیا کہ مسلمان غیر مذاہب کی لڑکیوں پر جبر و اکراہ کر کے ان سے اسلام قبول کرواتے ہیں۔ یہ ایک جھوٹا الزام ہے۔ اگر مسلمانوں نے ان ادوار میں زبردستی اسلام کو نہیں پھیلایا جب وہ دعوتِ دین کے جذبے سے سرشار اور سیاسی شان و شوکت سے مالا مال تھے تو آج جبکہ وہ مجموعی طور پر دعوت دین کے جذبے سے خالی اور دیگر اقوام کے مقابلے میں سیاسی کمتری و ابتری کا شکار ہیں تو وہ کس طرح اسلام پھیلانے میں زبردستی کر سکتے ہیں۔

اسلام کا مشہور اصول ہے: ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ (البقرہ:۲۵۶) ''دین میں کوئی زبردستی نہیں کی جا سکتی''۔ اس کا اصل مطلب یہی ہے کہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اگر کسی بڑے یا بچے کو اسلام میں داخلے سے روکا جائے۔ یا وہ اسلام قبول کرنے کی نیت و ارادہ لے کر آئے تو آپ اسے واپس کر دیں کہ جاؤ اپنے کافر والدین سے کافروں کی مذہبی کتابیں پڑھو، اس کے بعد اگر طلبِ اسلام کی کوئی رمق باقی بچے تو پھر آجانا!! ظاہر ہے یہ اسلام میں داخلے سے زبردستی روکنے کے بالکل مترادف ہے۔ اندازہ کریں کہ اسلام میں داخلے کے لیے زبردستی ممنوع ہے تو اسلام میں داخلے سے روکنے کے لیے زبردستی کرنا کتنا بڑا جرم ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان بھی یاد رکھنا چاہیے: «كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ، أَوْ يُنَصِّرَانِهِ، أَوْ يُمَجِّسَانِهِ» (صحیح بخاری) ''ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں''۔ تو ایک نابالغ شخص کو اسلام میں داخلے سے روکنا ایک غیر فطری جبر ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ» (سنن ابی داؤد) ''اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو

جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور نماز نہ پڑھنے پر ان کو سزا دو جب کہ وہ دس سال کے ہو جائیں اور ان کے بستر الگ کر دو"۔ یہ متفقہ بات ہے کہ اسلام کے عملی احکام پر عقائد کو ترجیح حاصل ہے۔ تو جب سات سالہ بچے کو نماز سکھانے کا حکم دیا جا رہا ہے تو اس کا ایمان و اسلام کا اقرار کس طرح ناقابلِ قبول قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو اسلام کی توسیع سے خائف ہیں اور اسلام کا دائرہ تنگ کرنا چاہتے ہیں ان کی نصیحت کے لیے ہم درج ذیل آیات پیش کرتے ہیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ○ثَانِيَ عِطْفِهِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾ (الحج:۸،۹) "اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے بلا کسی علم اور ہدایت اور کتابِ روشن کے، گردنوں کو اکڑائے ہوئے تاکہ گمراہ کریں اللہ کے راستے سے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ہم قیامت کے دن ان کو جلاتی آگ کا مزہ چکھائیں گے"۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾ (ص:۲۶) "بے شک جو لوگ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے۔۔۔"۔

*****

مولانا محمد اقبال
معاونِ شعبہ تحقیق وتصنیف، فقہ اکیڈمی

عبادت اور تقویٰ کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

سورۃ البقرہ، آیت:۲۱

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

”اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ تم متقی بن جاؤ“۔

آیتِ مبارکہ کی تفسیر

مؤمنین، کفار اور منافقین کے اوصاف بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوعِ انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں اپنے خالق کی عبادت کا حکم دیا ہے تاکہ اس کے ذریعے وہ متقی پرہیزگار بن جائیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات پائیں۔ ﴿اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ آیتِ مبارکہ کے اس حصے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے پروردگار کی عبادت کا حکم دیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی ”عبادت“ سے کیا مراد ہے۔ حضراتِ مفسرین اور اصحابِ فن کے ارشادات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے گا:

حضرت امام رازی رحمہ اللہ عبادت کی شرح اس طرح فرماتے ہیں: فَاعْلَمْ! أَنَّ الْعِبَادَةَ عِبَارَةٌ عَنِ الْإِتْيَانِ بِالْفِعْلِ الْمَأْمُورِ بِهِ عَلَى سَبِيلِ التَّعْظِيمِ لِلْآمِرِ (مفاتيح الغيب، التفسير الكبير، ج:۱، ص:۲۶) ”جان لیجیے! امر کرنے والے کی تعظیم کے طور پر فعل مامور بہ کی بجاآوری کو عبادت کہا جاتا ہے“۔

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ عبادت کے متعلق فرماتے ہیں: العبادة: هِيَ اسْمٌ جَامِعٌ لِكُلِّ ما يُحِبُّه اللهُ ويَرْضاهُ مِنَ الْأَقْوالِ وَالأَعْمالِ الظّاهِرَةِ وَالْباطِنَةِ (فتح المجيد شرح كتاب التوحيد، ص:٢٠) ''اقوال اور اعمالِ ظاہرہ وباطنہ میں سے ہر وہ چیز جو اللہ تعالی کی خوشنودی اور رضا کا باعث بنے اسے عبادت کہتے ہیں''۔

علامہ شریف جرجانی رحمہ اللہ عبادت کی تعریف یوں فرماتے ہیں: العبادة: هُوَ فِعْلُ الْمُكَلَّفِ عَلى خِلافِ هَوى نَفْسِهٖ؛ تَعْظِيمًا لِرَبّه (كتاب التعريفات، علي بن محمد بن علي الزين الشريف الجرجاني، ص:١٤٦،) اپنے رب کی تعظیم کے طور پر مکلف کے اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف ''فعل'' کو عبادت کہتے ہیں''۔

چنانچہ ان تعریفات کی روشنی میں ''عبادت'' کا مفہوم بالکل واضح ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔ لہذا عبادت نام ہے غایتِ تعظیم کے ساتھ اپنے خالق و مالک کے احکام کی بجاآوری اور اس کے اوامر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا خواہ وہ اعتقادات کے باب میں ہوں یا اقوال و اعمال ظاہرہ وباطنہ سے متعلق ہوں۔ وہ جس کام سے روک دیں اس سے رکنا اور جس کا حکم کریں اسے نہایت عاجزی کے ساتھ بجالانا عبادت ہے۔ ارکانِ اسلام؛ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائی نہ صرف عبادت میں شامل ہے بلکہ نہایت اہم اور ضروری عبادات میں سے ہیں۔

عبادت کی ایک خود ساختہ تفسیر

عصرِ حاضر کے ایک داعیٔ قرآن ''عبادت اور عبادات میں فرق'' کے تحت فرماتے ہیں: ''اصل میں ہمارے ہاں تصورات کے اندر جو خرابی اور کجی پیدا ہوئی وہ یہ ہے کہ ہم نے ''عبادت'' اور ''عبادات'' کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج عبادات ہیں لیکن عبادت فی الاصل کوئی اور شے ہے، جبکہ ہمارا تصورِ عبادت صرف انھی چند مراسمِ عبودیت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ہمارے دینی فکر کی سب سے بڑی اور سب سے بنیادی کجی ہے''۔

اس اقتباس میں ''عبادت'' اور ''عبادات'' کو ایک دوسرے سے الگ تصور کیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو چند مراسمِ عبودیت قرار دے کر اصل ''عبادت'' سے خارج کر دیا گیا ہے اور ''عبادت کو فی الاصل کوئی اور شے'' سمجھ لیا گیا ہے۔

پتا نہیں یہ تقسیم کن بنیادوں پر کی گئی ہے، حالانکہ اہلِ علم کے نزدیک عبادت نہایت عاجزی اور خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے پروردگار کے اوامر و احکام کی تعمیل ہے اور مذکورہ احکام؛ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج نہ صرف عبادت بلکہ ارکانِ اسلام اور رأس الطاعات ہیں۔ لہٰذا یہ مزعومہ تقسیم اکابر اہلِ علم کے تصورِ عبادت سے بالکل مختلف اور سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس نقطۂ نظر سے پیدا ہونے والے ایک غلط طرزِ عمل کا ذکر بھی ناگزیر ہے: جب ارکانِ اسلام یا عبادات کو مراسمِ عبودیت قرار دیا جاتا ہے تو کم فہم لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ عبادات مقصودِ اصلی نہیں، بلکہ کسی عظیم مقصد کی تیاری اور اس مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ وہ عظیم مقصد مختلف تحریکوں اور جماعتوں کا متعیّن کردہ ہوتا ہے۔ مثلاً کہیں انقلاب اور کہیں اقامتِ دین اور کہیں حکومتِ الٰہیہ کا قیام وغیرہ۔ اب انقلاب یا حکومت کا قیام اہم ترین اور عظیم ترین مقصد قرار پاتا ہے چنانچہ نماز اس مقصد کے لیے قائم کی گئی تحریک کے امیر کی اطاعت سکھاتی ہے، نظم و ضبط کا خوگر بناتی ہے، زکوٰۃ اس تحریک کے لیے مال خرچ کرنے کی تربیت کا ذریعہ ہے، حج انقلابی سرگرمیوں کے لیے گھربار چھوڑنے کی مشق ہے علیٰ ہذا القیاس۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باجماعت نماز ترک کی جاسکتی ہے اگر کوئی مشاورت، جلسہ یا خصوصی خطاب ہو۔ تراویح ترک کر دی جاتی ہے اگر کسی ترجمۂ قرآن کی محفل کا انتظام سنبھالنا ہو، ستم یہ کہ بہت سے نادان لوگ ترجمۂ قرآن کی محافل میں تراویح کے وقفے میں آرام فرمانے لگے تاکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے منعقد کیے گیے خطبات کو توجہ سے سن سکیں۔ بہت سی مذہبی تنظیموں کے کارکن 'ہینڈ بل' تقسیم کرنے کے لیے سنن و نوافل ترک کرنے میں کوئی عار نہیں پاتے اور نمازِ عید کے بعد خطبہ سننا ضروری نہیں سمجھتے کہ مقصودِ اصلی تو انقلاب یا حکومت ہے۔ اسی طرح بہت سے شرعی امور شرائط و ارکان کی حساسیت سے محروم ہوجاتے ہیں مثلاً زکوٰۃ سے کسی بستی میں کنواں کھدوا دیا، اور مالِ زکوٰۃ کسی مستحق کی ملکیت بنانا ایک اضافی بات قرار پاتی ہے وغیرہ۔ اس تصور کی اصلاح ناگزیر ہے کہ یہ عبادات ہی مقصود ہیں اور اس پر بہت سی احادیث شاہد ہیں۔ سیرت کے بے شمار واقعات اس تصور کی نفی کرتے ہیں۔

تقویٰ اور عبادت کی شرح میں اکابر مفسرین کے چند اقوال

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ آیتِ مبارکہ کے اس حصے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تم اپنے پروردگار کی عبادت میں لگے رہے تو اس کا

نتیجہ تمھارے حق میں یہ نکلے گا کہ متقی اور پرہیزگار بن جاؤ گے اور باری سبحانہ وتعالیٰ کی خوشنودی تمھیں حاصل ہو جائے گی۔کیونکہ ’’تقویٰ‘‘ قربِ باری تعالیٰ کا وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنے رب کے ماسویٰ سے یکسر لاتعلق ہو کر رہ جاتا ہے۔

مشہور مفسرِ قرآن امام طبری رحمہ اللہ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ کی تشریح میں فرماتے ہیں: وتَأْوِيلُ ذَلِكَ: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ بِعِبَادَتِكُم رَبَّكُم الَّذِي خَلَقَكُمْ وطَاعَتِكُمْ إِيَّاهُ فِيما أَمَرَكُمْ بِهِ وَنَهَاكُمْ عَنْهُ، وإِفْرَادِكُمْ لَهُ الْعِبَادَةَ لِتَتَّقُوا سَخَطَهُ وَغضَبَهُ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ، وَتَكُونُوا مِنَ الْمُتَّقِينَ الَّذِينَ رَضِيَ عَنْهُمْ رَبُّهُمْ (جامع البيان في تأويل القرآن، محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبري، ج:١، ص:٣٦٨) ’’اس کی تفسیر یہ ہے: تاکہ تم اپنے اس پروردگار کی جس نے تمھیں پیدا کیا ہے عبادت کے ذریعے، یعنی اوامر کو بجالانے اور منہیات سے اجتناب کے ذریعے متقی بن جاؤ، عبادت اُسی کے لیے خالص کرنے کی وجہ سے اس کی ناراضی اور غضب سے بچ جاؤ اور تم ان متقی بندوں میں سے ہو جاؤ جن سے ان کا رب راضی ہوا ہے‘‘۔

اسی طرح علامہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ اس آیت کی شرح میں فرماتے ہیں: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ حَالٌ مِن الضَّمِيرِ في اعْبُدُوا كَأَنه قال: اُعْبُدُوا رَبَّكُم راجِينَ أن تَنْخَرِطوا في سِلْكِ الْمُتقينَ الْفائِزينَ بِالْهدى وَالْفَلاحِ، اَلْمُسْتَوجِبِينَ جَوارَ اللهِ تَعالیٰ، نَبَّهَ بِهِ على أَنَّ التَّقْوى مُنْتَهى دَرَجَاتِ السّالِكِينَ وهُوَ التَّبَرِي مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سِوَى اللهِ تعالى إلى اللهِ(أنوار التنزيل وأسرار التأويل،ناصر الدين أبو سعيد عبد الله بن عمر بن محمد الشيرازي البيضاوي) ’’یہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ اعْبُدُوا کی ضمیرِ مخاطب سے حال واقع ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کی اس امید پر عبادت کرو کہ تم متقین کی لڑی میں پروئے جاؤ گے وہ متقین جو قربِ الٰہی کے اسباب یعنی ہدایت وفلاح کے مقام پر فائز ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے اس بات پر متنبہ فرمایا کہ تقویٰ مدارج سلوک کا آخری درجہ ہے اور یہ کہ تقویٰ ماسوی اللہ سے بے زار ہو کر خدا کا ہو لینا ہے‘‘۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ کے ترجمے پر اعتراض

بعض حضرات نے آیتِ مبارکہ کے اس حصے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ کا اُردو میں یہ ترجمہ کیا ہے ”تاکہ تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے“۔ یہ درست ترجمہ ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، مگر مذکورہ داعیِ قرآن اس اردو ترجمے کے متعلق فرماتے ہیں: ”﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ کا ترجمہ عام طور پر کر دیا جاتا ہے: ”تاکہ تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے“ یہ صحیح نہیں ہے“۔ ان کا یہ اعتراض بھی سابقہ اعتراض کی طرح درست معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ ہم نے اوپر اکابر مفسرین کی اس آیت کی تفسیر کے تحت مفاہیم کا جائزہ لیا ہے اور انھوں نے جو معنیٰ بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں درج بالا ترجمہ ”تاکہ تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے“ درست معلوم ہوتا ہے، اس میں بظاہر کوئی اشکال نہیں ہے، اسے غلط قرار دینا محلِ نظر ہے۔ واللہ اعلم

*****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

تعلیم و تعلم سے بے رغبتی کی مذمت

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبْزَى رضي الله عنه قَالَ: خَطَبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ فَأَثْنَى عَلَى طَوَائِفَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا ثُمَّ قَالَ: «مَا بَالُ أَقْوَامٍ لَا يُفَقِّهُونَ جِيرَانَهُمْ وَلَا يُعَلِّمُونَهُمْ وَلَا يَعِظُونَهُمْ وَلَا يَأْمُرُونَهُمْ وَلَا يَنْهَوْنَهُمْ

حضرت عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے خطاب فرمایا جس میں مسلمانوں کے کچھ گروہوں کی تعریف فرمائی پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ”(علم والے) لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ اپنے پڑوسیوں میں دین کی سمجھ نہیں پیدا کرتے، نہ انھیں تعلیم دیتے ہیں اور نہ انھیں وعظ و نصیحت کرتے ہیں نہ انھیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور نہ ہی انھیں برائی سے روکتے ہیں

وَمَا بَالُ أَقْوَامٍ لَا يَتَعَلَّمُونَ مِنْ جِيرَانِهِمْ وَلَا يَتَفَقَّهُونَ وَلَا يَتَّعِظُونَ وَاللهُ لَيُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِيرَانَهُمْ وَيُفَقِّهُونَهُمْ وَيَعِظُونَهُمْ وَيَأْمُرُونَهُمْ وَيَنْهَوْنَهُمْ وَلْيَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِنْ جِيرَانِهِمْ وَيَتَفَقَّهُونَ وَيَتَفَطَّنُونَ أَوْ لَأُعَاجِلَنَّهُمُ الْعُقُوبَةَ»

اور لوگوں کو کیا ہو گیا کہ اپنے پڑوسی (اہلِ علم) سے علم نہیں حاصل کرتے اور نہ ہی ان سے دین میں سمجھ حاصل کرتے ہیں اور نہ ہی ان سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ خدا کی قسم اُن لوگوں کو اپنے پڑوسیوں کو پڑھانا ہو گا اور انھیں فقاہت سکھانا ہو گی اور ان کے وعظ و نصیحت کا اہتمام کرنا ہو گا اور انھیں نیکی کا حکم دینا ہو گا اور انھیں برائی سے روکنا ہو گا اور ان پڑوسیوں کو بھی اپنے اہلِ علم سے علم حاصل کرنا ہو گا اور ان سے فقاہت و سمجھ داری سیکھنا ہو گی یا پھر میں ان کو جلد ہی سزا دوں گا“۔

ثُمَّ نَزَلَ،فَقَالَ قَوْمٌ:مَنْ تَرَوْنَهُ عَنَى بِهَؤُلَاءِ؟ قَالَ الْأَشْعَرِيِّينَ، هُمْ قَوْمٌ فُقَهَاءُ وَلَهُمْ جِيرَانٌ جُفَاةٌ مِنْ أَهْلِ الْمِيَاهِ وَالْأَعْرَابِ.فَبَلَغَ ذَلِكَ الْأَشْعَرِيِّينَ فَأَتَوْا رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! ذَكَرْتَ قَوْمًا بِخَيْرٍ وَذَكَرْتَنَا بِشَرٍّ فَمَا بَالُنَا

پھر آپ ﷺ منبر سے اتر کر اندر تشریف لے گئے۔ لوگ آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگے: ''آپ ﷺ کا روے سخن کس طرف تھا''۔ کسی نے کہا آپ ﷺ کا اشارہ اشعری قبیلے کی طرف تھا۔ وہ قومِ فقہا ہیں اور ان کے پڑوسی پانیوں کے پاس رہنے والے دیہاتی لوگ ہیں۔ یہ بات اشعریوں تک پہنچی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: ''یا رسول اللہ آپ نے لوگوں کا اچھا ذکر کیا اور ہمارا ذکر برائی کے ساتھ کیا، ہمارا کیا معاملہ ہے؟''۔

فَقَالَ: «لَيُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِيرَانَهُمْ وَلَيُفَقِّهَنَّهُمْ وَلَيُفَطِّنَنَّهُمْ وَلَيَأْمُرَنَّهُمْ وَلَيَنْهَوْنَهُمْ وَلَيَتَعَلَّمْنَ قَوْمٌ مِنْ جِيرَانِهِمْ وَيَتَفَطَّنُونَ وَيَتَفَقَّهُونَ أَوْ لَأُعَاجِلَنَّهُمُ الْعُقُوبَةَ فِي الدُّنْيَا»

آپ ﷺ نے فرمایا: ''(اہلِ علم) لوگوں کو اپنے پڑوسیوں کو علم سکھانا ہوگا اور انھیں فقاہت اور سمجھ سکھانا ہوگی اور انھیں برائی سے روکنا ہوگا اور انھیں نیکی کا حکم کرنا ہوگا اور ان کو برائی سے روکنا ہوگا اور ان (عوام) کو بھی اپنے اہلِ علم سے علم حاصل کرنا پڑے گا اور ان سے فقہ فی الدین اور سمجھ داری سیکھنا ہوگی ورنہ میں انھیں جلد دنیا ہی میں سزا دوں گا''۔

فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! أَنُفَطِّنُ غَيْرَنَا؟ فَأَعَادَ قَوْلَهُ عَلَيْهِمْ وَأَعَادُوا قَوْلَهُمْ: أَنُفَطِّنُ غَيْرَنَا؟ فَقَالَ ذَلِكَ أَيْضًا فَقَالُوا: أَمْهِلْنَا سَنَةً. فَأَمْهَلَهُمْ سَنَةً لِيُفَقِّهُونَهُمْ وَيُعَلِّمُونَهُمْ وَيُفَطِّنُونَهُمْ

لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ کیا ہمیں دوسروں کو پڑھانا سکھانا ہوگا؟، آپ ﷺ نے اپنی پہلی والی بات ہی دہرائی۔ ان لوگوں نے پھر سوال کیا: ''یا رسول اللہ کیا ہمیں واقعی دوسروں کو تعلیم دینا ہو گی؟''۔ آپ ﷺ نے وہی بات پھر دہرائی۔ ان لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہمیں ایک سال کی مہلت دیں۔ آپ ﷺ نے انھیں ایک سال کی مہلت دی تاکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو علمِ دین اور فقاہت و سمجھ داری سکھا سکیں۔

ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ هَذِهِ الْآيَةَ ﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ [المائدة:۷۸] (رواه الطبراني في المعجم الكبير)

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ''لعنت کی گئی بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر داود اور عیسی ابن مریم علیہما السلام کی زبانی۔ یہ اس سبب سے تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حدوں کو توڑتے تھے''۔

فائدہ

حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ جہاں اہلِ علم کی ذمے داری ہے کہ وہ علمِ دین کے فروغ کے لیے کام کریں وہیں عوام الناس کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ اہلِ علم سے رابطہ کر کے ان سے استفادہ کریں۔ نیز فقہ، وعظ وارشاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ علم دین ہی کے مختلف شعبے ہیں۔

*****

محمد بلال احمد/ صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
طالبِ علم فقہ اکیڈمی/ مدیر ماہنامہ مفاہیم کراچی

فہمِ قرآن کے دو رجحان

''لفظ پادری کو بھی اتنا ہی عام ہو جانا چاہیے جتنا لفظ عیسائی''۔ یہ سولھویں صدی عیسوی میں اٹھنے والی تحریکِ اصلاحِ مذہب (Reformation) کے مرکزی کردار مارٹن لوتھر کا مشہور جملہ ہے۔ اس جملے کا پس منظر یعنی کلیسا کے جبر و استبداد اور داخلی فسادات و تضادات ابھی موضوعِ بحث نہیں ہیں، جاننے والے جانتے ہیں کہ انھی کا ردعمل تحریکِ اصلاح مذہب کی صورت میں ہوا جو ایک نئے فرقے پروٹسٹنٹ کے جنم پر منتج ہوئی۔ عیسائی روایت اور اس کے مراتب و مراکزِ علمی کی بے توقیری اور اس کے اختیار کا انکار پروٹسٹنٹ کا عام وتیرہ تھا۔ انھوں نے قرار دیا کہ دین کی تشریح اور انجیل کی تفسیر پر کسی پادری کا اجارہ نہیں ہے بلکہ 'ہر عیسائی' یہ حق رکھتا ہے۔ پوپ اور پادری کے اختیار گھٹانے یا ختم کرنے سے فائدہ تو یہ ہوا کہ چرچ کی بدعنوانیوں سے نجات اور آزادی ملی لیکن اس مارا ماری میں دین و مذہب کی جان نکل گئی اور نفسِ مذہب ہی سے آزادی جیسے خوفناک نتائج کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ''ہر عیسائی کو پادری ہونا چاہیے اور ہر پادری کو انجیل کی تشریح کا حق ہونا چاہیے'' یہ اصل میں چرچ کی اس روایت سے بغاوت اور انکار تھا جس کا تسلسل صدیوں پہ محیط تھا۔ جب روایت کا پہرہ ٹوٹا تو اب نت نئے اور بھانت بھانت کے فلسفے سر اٹھانے لگے۔ جس کے نتیجے میں مغرب کا موجودہ خدا آزاد بلکہ خدا بیزار معاشرہ پیدا ہوا۔

مذہبی روایت سے آزادی بلکہ بغاوت کی ایسی ہی صدائیں عالمِ اسلام میں بھی ایک عرصے سے بلند ہو رہی ہیں اور فکر مندی کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے خوش نما نعرے عالمِ اسلام میں مقبولیت بھی حاصل کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ عیسائیت میں کلیسا سے آزادی کی باتیں کسی درجے برمحل بھی تھیں لیکن دینِ اسلام میں تو بے جا اور بے محل ہیں۔ ایسی صداؤں کے پیچھے عموماً رجالِ دین اور دین میں موجود سلسلۂ مراتب (Hierarchy) سے آزادی کا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اہلِ کتاب کا کتاب اللہ سے تعامل ایک عرصہ درست بنیادوں پر قائم رہا اور دین و مذہب پر چرچ کے اختیار کی درست بنیادیں بھی موجود تھیں: ﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللهِ﴾ (المائدہ:۴۴) ''انبیاے کرام ان کتابوں کے مطابق فیصلے کرتے رہے ان لوگوں کے لیے جو فرماں بردار تھے یہودیوں میں سے، اور دیگر اللہ والے اور علما بھی، بہ سبب اس کے کہ وہ محافظ بنائے گئے تھے کتاب اللہ پر''۔ کتاب اللہ چونکہ مجموعۂ الفاظ ہے اور یہ الفاظ ایضاحِ مراد کے لیے تشریح کے محتاج ہوتے ہیں۔ کتاب اللہ کے الفاظ کی شرح، پیغمبر کے اقوال و افعال کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اس کام کے اہل وہ علماے کتاب ہی ہوتے ہیں جو ایک طرف کتاب کی زبان و اسلوب پر قدرت کے ساتھ پیغمبر کے اقوال و افعال سے واقف ہوں اور یہ واقفیت بھی یا تو براہ راست ہونی چاہیے اور جہاں اس کا امکان نہ ہو وہاں نبی کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں کے شاگردوں سے منقول ہونی چاہیے۔ اس سینہ بہ سینہ شاگردی ہی کا نام دینی روایت ہے۔ چونکہ علماے کرام اس روایت کے امین ہوتے ہیں اس لیے انھی کو کتاب اللہ کا محافظ قرار دیا گیا کہ کتاب کی وہی تشریح درست قرار دی جاسکے گی جس پر گروہِ علما صاد کرے۔ تو اس تفصیل کی روشنی میں یہ سمجھنا چاہیے کہ کتبِ مقدسہ کی تشریح و تفہیم میں چرچ کا اپنے اختیارات پر اصرار کرنا تو غلط نہ تھا۔ غلطی اس تجاوزِ حدود میں تھی جو چرچ نے روا رکھا، وہ بجائے اس کے کہ کتاب اللہ کے معارف و مسائل کو بیان کرتے دنیاوی اغراض کے لیے اسے چھپانے لگے اور اس کی غلط تشریح کرنے لگے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ﴾ (آلعمران:۱۸۷) ''اور جب ہم نے پختہ وعدہ لیا ان لوگوں سے جنھیں کتاب دی گئی تھی کہ تم اسے لوگوں کے لیے بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔ لیکن انھوں نے اس کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت کے عوض اسے بیچ ڈالا، پس کیا ہی برا ہے جو وہ خرید و فروخت کرتے ہیں''۔ اس بُری سوداگری کا ایک مظہر یہ بھی تھا کہ علماے نصاریٰ نے کتاب اللہ یعنی انجیل کو عوام کی

رسائی سے دور کر دیا تھا۔ کسی عام عیسائی کو اس کو پڑھنے کی اجازت تھی نہ ہی وہ اس کی زبان (لاطینی) سیکھ سکتا تھا، بعض مقامات پر تو شدت کا یہ عالم تھا کہ اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ کوئی عام عیسائی کتاب اللہ کے الفاظ سن بھی نہ سکے۔ جب عوام الناس سے کتاب کو چھپا لیا گیا تو اب اگلا مرحلہ تحریف و تدلیس بھی آسان ہو گیا: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ﴾ (المائدہ:۱۳) ''پس بسبب ان کے میثاق کو توڑنے کے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلام کو اس کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں اور جو نصیحت انھیں کی گئی تھی اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے''۔ اپنے اس طرزِ عمل سے انھوں نے تفہیم و تشریح کے بجائے تدلیس و تلبیس کو اپنا وتیرہ بنا لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحلیل و تحریم کا اختیار ان کے ہاتھوں میں ہو کر رہ گیا اور وہ لوگوں کے گویا 'رب' بن بیٹھے۔ اس بات کی تائید حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے واقعے سے بھی ہوتی ہے۔ جنابِ نبی کریم ﷺ نے سورۃ التوبہ کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ (التوبۃ:۳۱) ''انھوں نے اللہ کے بجائے اپنے احبار (یعنی یہودی علما) اور راہبوں (یعنی عیسائی درویشوں) کو خدا بنا لیا ہے''۔ پھر ارشاد فرمایا: «أَمَا إِنَّهُم لَمْ يَكُونُوا يَعْبُدُونَهُمْ، وَلَكِنْ إِذَا كَانُوا أَحَلُّوا شَيْئًا اِسْتَحَلُّوهُ وَإِذَا حَرَّمُوا عَلَيْهِمْ شَيْئًا حَرَّمُوهُ» (ترمذی، ابواب التفسیر) ''وہ ان کو پوجتے نہ تھے، بلکہ جب وہ کسی حرام کردہ چیز کو حلال کرتے تو یہود و نصاریٰ بھی اس کو حلال کر لیتے تھے اور جب کسی حلال کردہ چیز کو حرام کرتے یہود و نصاریٰ بھی اس کو حرام ٹھہرا لیتے تھے''۔

چرچ کے جس اختیار کو ہم نے اوپر تسلیم کیا وہ اختیار انھی دلائل سے علمائے اسلام کو بھی حاصل ہے کہ وہ کتاب و شریعت کی تشریح میں ایک معیار بلکہ ایک نگران و محافظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ «أَنَّ العُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، وَرَّثُوا العِلْمَ، مَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ» (صحیح بخاری) ''بے شک علما ہی پیغمبروں کے وارث ہیں جنھوں نے علومِ نبوت کی وراثت پائی جس نے بھی اس علم میں سے حصہ پایا اس نے (وراثتِ پیغمبری) میں وافر حصہ پالیا''۔ اس کے برعکس دینِ اسلام کی روایت عیسائیت کی اس مسخ شدہ روایت سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلام میں کبھی بھی اس طرح کی اجارہ داری قائم نہیں

ہوئی۔ کتاب اللہ کی قراءت و تلاوت اور حصولِ فہم کے راستوں کو کبھی بھی مسدود نہیں کیا گیا۔ بلکہ علمائے کرام نے نظری طور پر عوام کو حفظ و ناظرہ کی طرف متوجہ کیا، تلاوت و حفظ کے فضائل تحریر و تقریر کے ذریعے عام کیے اور پھر عملاً ناظرے و حفظ کے مکاتب و مدارس قائم کیے۔ اسی لیے اصل متنِ کتاب تک ہر مسلمان کی رسائی ہے۔ علما نے علاقائی زبانوں میں ترجمہ و تفسیر کی زبانی و تحریری اشاعت سے عوام میں علومِ قرآنی کو فروغ دیا۔

حدیثِ مبارکہ کے الفاظ ”جس نے بھی اس علم میں سے حصہ پایا اس نے (وراثتِ پیغمبری) میں وافر حصہ پالیا“ سے اشارہ نکلتا ہے کہ پیغمبر کا وارث بننے کا انحصار کسی ذات یا رنگ و نسل پر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار حصولِ علمِ دین پر ہے جس نے علم کی خاص مقدار جمع کر لی وہ نبی کی وراثت پر فائز ہو گیا۔ یہاں کبھی بھی ذات پات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ قرونِ اولیٰ میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے موالی امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ (موالی: مولیٰ کی جمع، معنیٰ: آزاد کردہ غلام) فقہائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجل تلامیذ موالی ہی تھے۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم کا مشہور قول ہے: لَمّا مَاتَ الْعَبَادَلَةُ صَارَ الْفِقْهُ فِي جَمِيعِ الْبُلْدانِ إِلَى الْمَوَالِي إلّا الْمَدِينَة ”جب عبادلہ اربعہ (حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم) کا انتقال ہو گیا تو سوائے مدینے کے، تمام شہروں میں فقہ موالی حضرات کے مرہون ہی رہ گئی“۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے امام ابن شہاب الزہری رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف شہروں کے ائمہ کا ذکر کیا تو ہر شہر میں کسی نہ کسی مولیٰ ہی کو شیخ اور استاد پایا۔ اس پر خلیفہ نے تعجب کیا تو امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ إِنَّمَا هُوَ أَمْرُ اللهِ وَدِينُهُ مَنْ حَفِظَهُ سَادَ ”اے امیر المومنین! یہ اللہ کے احکام اور اس کے دین کی بات ہے جس نے ان کی حفاظت کی سردار بن گیا“۔ دورِ آخریں کی بات کریں تو ایک یہودی شخص نے اسلام قبول کر کے علمی میدان میں مہارت کا ثبوت دیا تو مسلمان اسے علامہ محمد اسد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک سکھ مسلمان ہو کر مدرسے کا شاگرد بنا تو آج ہم اسے مولانا عبیداللہ سندھی کے نام سے جانتے ہیں۔ خیر یہ تو چند مثالیں تھیں ورنہ ہماری تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اسلامی روایت علم دوستی پر مبنی ہے جس نے اس کا حق ادا کیا اسے بھی اس کا حق دیا گیا۔

دوسری اہم بات یہ کہ علمائے کرام کی مشیخیت اور حفاظت و نگرانی مبنی بر اصول ہے یعنی یہاں اگر کوئی استاد الحفاظ بھی کسی زبر زیر کی غلطی کرے گا تو اسی کے کئی ایک شاگرد اسے ٹوکنے کو موجود ہوں گے۔ اسلامی روایت میں مختلف فنون کے اصول و ضوابط طے ہیں۔ یہاں اصولِ فقہ، اصولِ اجتہاد، اصولِ فتوی اصولِ حدیث و تفسیر اور اصولِ عقیدہ وغیرہ مدون شدہ موجود ہیں۔ تو یہ تمام ماہرینِ شریعت اپنے میدان کے اصولوں کے پابند ہیں۔ یہاں اگر کوئی مفتی ان اصولوں سے انحراف کرے گا تو اسی مسلک کے مفیان اس کے ناقد بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اگر کوئی مفسر و محدث بھی کوئی ایسی تشریح کرے گا جو اسلامی علمیت کے مطابق نہ ہوگی تو دوسرے علمائے کرام اس پر نقد کر کے اس کے قول کو تفرد قرار دیں گے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ ہماری روایت عیسائیت و یہودیت کے برخلاف ایک بہت منظم و منضبط روایت ہے۔ ایسی صورت میں اسلام میں موجود سلسلۂ مراتب سے آزادی نقصانِ محض کے علاوہ کسی اور چیز کی موجِب نہیں ہو سکتی۔ اس طویل تمہید کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اسلام اور عیسائیت کی روایات میں موجود جوہری فرق سامنے آجائے تاکہ اسلام کے فرقِ مراتب علمی اور کلیسا کے استبداد میں اشتباہ پیش نہ آئے اور کوئی نادانی میں اسلامی روایت یا بہ الفاظِ دیگراں ''ملّائیت'' کو پاپائیت قرار دینے کا گناہ نہ کرے۔

دینی روایت کے بارے میں چند اشکالات

اگرچہ جدید حضرات میں روایت کے بارے میں متعدّد اشکالات پائے جاتے ہیں لیکن سرِدست ہم ان پر بات کرتے ہیں جو قرآنِ حکیم سے جڑے ہونے کی وجہ سے زیادہ تر بیان ہوتے ہیں۔ پہلا اشکال یا الزام یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے افہام و تفہیم پر مولویوں نے ناجائز قدغنیں عائد کر رکھی ہیں۔ قرآن نہایت آسان کتاب ہے، ہم خود پڑھیں گے اور خود سمجھیں گے۔ اس کے لیے کسی قسم کے لمبے چوڑے علوم کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے لیے وہ سورۃ القمر کی آیتِ مبارکہ کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اجی دیکھیں اللہ تو کہہ رہا ہے کہ قرآن آسان ہے اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن مشکل ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ فہمِ قرآن کے دو درجے ہیں۔ ایک کو تذکر بالقرآن کہا جاتا ہے اور دوسرے کو تدبر القرآن کہا جاتا ہے۔ قرآن و سنت میں بعض احکامات تو ایسے ہیں جن میں کسی قسم کا کوئی اِبہام، اِجمال یا

ظاہری تعارض نہیں ہوتا اور بغیر کسی خاص الجھن کے ان کا معنی باآسانی سمجھا جا سکتا ہے مثلاً: ﴿وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا﴾ (الحجرات:۱۲) ”اور برا نہ کہو ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے“ اور ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ (الاسراء:۲۳) ”اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو“۔ یہ قرآنِ کریم سے بنیادی نصیحت (تذکر) کا حصول ہے اور ایسے احکام کے لیے کسی خاص دقت کا شکار نہیں ہونا پڑتا۔ حلال و حرام کے بیشتر احکام اور اصول و مسلماتِ دینیہ اکثر و بیشتر اسی پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ آپ یوں سمجھ لیں کہ جھیل کی سطح پر تیرتا ہوا کنول ہے۔ لیکن انھی امور کے تفصیلی احکام، موتی اور مونگوں کی مانند ہیں جن کو پانے کے لیے پانیوں کی گہرائی میں غوطہ زن ہونا پڑتا ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ بالا آیاتِ کریمہ سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ غیبت نہیں کرنا چاہیے لیکن غیبت کی تعریف کیا ہے؟ چلیں یہ بھی آسان ہے لیکن وہ کون سی صورتیں ہیں جن میں کسی کے حقیقی عیب کو بیان کرنا جائز ہو جاتا ہے اور وہ کون سی صورتیں ہیں جن میں کسی کے حقیقی عیب کا بیان واجب ہو جاتا ہے۔ پھر والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم تو درج بالا آیت سے معلوم ہو گیا لیکن اس کی حدود و قیود کیا ہیں؟ تو معلوم ہوا کہ آسان اور واضح حکم بھی اپنی تعمیل کے لیے تشریح کا محتاج ہوتا ہے۔

سورۃ القمر کی آیت ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ﴾ (القمر:۱۷) ”اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بالکل آسان بنا دیا ہے“ کا مطلب کیا ہے؟ اس کی وضاحت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ معارف القرآن میں ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں: ”قرآنِ کریم نے اپنے مضامینِ عبرت و نصیحت کو ایسا آسان کر کے بیان کیا ہے کہ جس طرح بڑے سے بڑا عالم و ماہر فلسفی اور حکیم اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح ہر عامی جاہل جس کو علوم سے کوئی مناسبت نہ ہو وہ بھی عبرت و نصیحت کے مضامینِ قرآنی کو سمجھ کر اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس آیت میں یَسَّرْنا کے ساتھ لِلذِّکْر کی قید لگا کر یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ قرآن کو حفظ کرنے اور اس کے مضامین سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی حد تک اس کو آسان کر دیا گیا ہے، جس سے ہر عالم و جاہل، چھوٹا اور بڑا یکساں فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآنِ کریم سے مسائل اور احکام کا استنباط بھی ایسا ہی آسان ہو، وہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مشکل فن ہے جس میں عمریں

صرف کرنے والے علمائے راسخین کو ہی حصہ ملتا ہے، ہر ایک کا وہ میدان نہیں۔ اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو قرآنِ کریم کے اس جملے کا سہارا لے کر قرآن کی مکمل تعلیم، اس کے اصول و قواعد سے حاصل کیے بغیر مجتہد بننا اور اپنی رائے سے احکام و مسائل کا استخراج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کھلی گمراہی کا راستہ ہے"۔

ایک اشکال یہ بھی ہے کہ علمائے کرام قرآنِ حکیم کی درس و تدریس سے روکتے ہیں۔ ہمارے مضمون کو اگر سمجھ لیا گیا تو اس کی روشنی میں یہ ماننا مشکل نہیں کہ علمائے کرام درس و تدریسِ قرآن سے منع نہیں کرتے بلکہ اس اہم کام کے اصول و ضوابط کو ملحوظ نہ رکھنے والوں کو درس و تدریس سے منع کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے ساتھ تعامل میں معیار کو نظر انداز کرنا یا سرے سے یہ سمجھنا کہ اس کام کا کوئی لمبا چوڑا معیار نہیں ہے ایک خوفناک امر ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم "آسان ترجمۂ قرآن" کے مقدمے میں لکھتے ہیں: "افسوس ہے کہ کچھ عرصے سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیرِ قرآن کے لیے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآنِ کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شد بد رکھنے والے لوگ، جنھیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پُرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اِنتہائی خطرناک طرزِ عمل ہے، جو دِین کے معاملے میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، دُنیوی علوم و فنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کر لے تو دنیا کا کوئی صاحبِ عقل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو، اس لیے کہ ڈاکٹر بننے کے لیے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح انگریزی دان انجینیرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینیر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینیر تسلیم نہیں کر سکتا،

اس لیے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا،بلکہ اس کے لیے ماہر اساتذہ کے زیرِ تربیت رہ کران سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینیر بننے کے لیے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملے میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کافی کیسے ہو سکتا ہے؟ زندگی کے ہر شعبے میں ہر شخص اس اُصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنھیں پورا کیے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنت اتنے لاوارث کیسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لیے کسی علم و فن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملے میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کر دے؟''۔

فہمِ قرآن کے جس رتبے کو ہم نے تدبر فی القرآن سے تعبیر کیا، وہ موضوع اسلافِ امت کے یہاں ایک معمولی فرق کے ساتھ ''تفسیرِ قرآن'' کے عنوان کے تحت بیان ہوتا رہا ہے۔ اس بات کی تائید اسلافِ امت کے یہاں تفسیرِ قرآن کی اہلیت سے بھی ہوتی ہے۔ تفسیرِ قرآن، تدبر فی القرآن کے مقابلے میں نسبتاً ایک خاص لفظ ہے اور نسبتاً خاص معنی میں بولا اور سمجھا جاتا ہے البتہ جو قدر مشترک ہے وہ ان دونوں کاموں کی اہلیت و استعداد ہے۔ چنانچہ، امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الإتقان في علوم القرآن'' کے چوتھے جز میں مفسِر کی شرائط شمار کرتے ہوئے درج ذیل علوم ذکر کرتے ہیں: يَجُوزُ تفسيرُهُ لِمن كان جامِعا لِلْعُلُومِ الَّتي يَحْتاجُ المُفَسِّر إليها، و هي خمسةَ عَشَرَ عِلْما: أَحدُهَا: اللُّغَة، الثّاني: اَلنَّحو، الثَّالِث: التَصْرِيْف، الرّابع: الاِشْتِقاق، الخامِس والسّادِس والسّابع: المَعاني والبَيَان وَالْبَدِيْع، الثّامِن: عِلْمُ الْقِراءات، التّاسِع: أُصُوْلُ الدِّيْن، الْعَاشِر: أُصُوْلُ الْفِقْه، اَلْحَادِي عَشَر: أَسْبابُ النُّزُولِ وَ الْقَصَص، الثّاني عَشَر: اَلنّاسِخُ وَالْمَنْسُوخ، اَلثّالِث عَشَر: اَلْفِقْه، الرَّابِع عَشَر: اَلْأَحَادِيْثُ الْمبَيِّنَةُ لِتَفْسِيرِ الْمُجْمَلِ وَالْمُبْهَمِ، اَلْخَامِس عَشَر: عِلْمُ الموهبة (الاتقان فی علوم القرآن، جز:۴، ص:۱۶۷) ''تفسیر کرنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو تفسیر کرنے کے لیے ضروری علوم پڑھا ہوا ہو، اور ان ضروری علوم کی تعداد پندرہ ہے: عربی زبان، علمِ نحو، علمِ صرف، علمِ اشتقاق (الفاظ کے مأخذات کا علم)، علومِ معانی و بیان و بدیع (علمِ بلاغت)، علمِ قراءت، علمِ عقیدہ، علمِ اصولِ فقہ، آیات کا شانِ نزول، علمِ ناسخ و منسوخ، علمِ فقہ، ان روایات کی معلومات جو مبہم آیات کی تفسیر میں

وارد ہوئی ہیں، علمِ لدنی (یہ وہ علم ہے جو اللہ تعالی انسان پر اس وقت کھولتے ہیں جب انسان اپنے حاصل کردہ علم پر عمل کرنے لگ جائے)۔

یہ وہ علوم جن کو اگر اجمالاً بیان کیا جائے تو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس اللہ روحہ کی یہ عبارت بنے گی: يُحْرَمُ الْخَوْضُ فِي التَّفْسِيرِ لِمَنْ لَّا يَعْرِفُ اللِّسَانَ الَّذي نَزَلَ الْقُرْآنُ بِهِ وَالْمَأْثُورَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَ أَصْحابِه والتَّابِعِيْنَ مِنْ شَرْحِ غَرِيْبٍ وَ سَبَبِ نُزُوْلٍ وَ نَاسِخٍ وَ مَنْسُوْخٍ (حجۃ اللہ البالغہ، ج:۱، ص:۴۱۲) ''اس شخص کے لیے تفسیر سے اشتغال حرام ہے جو اس زبان کو نہیں جانتا جس میں قرآن نازل ہوا، اور نہ ان روایات کو جانتا ہے جو نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ و تابعین سے مروی ہیں، خواہ وہ کسی مشکل لفظ کی شرح ہو، یا شانِ نزول یا ناسخ و منسوخ۔

اس مسئلے پر شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم ''آسان ترجمۂ قرآن'' کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں: ''مفسرِ قرآن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کی نحو و صرف اور بلاغت و ادب کے علاوہ علمِ حدیث، اصولِ فقہ و تفسیر اور عقائد و کلام کا وسیع و عمیق علم ضرور رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآنِ کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا''۔

بیان کردہ علمی معیار سے کمتر کسی آدمی کو درسِ قرآن دینے کا کوئی جواز نہیں۔ الاتقان فی علوم القرآن میں جلیل القدر تابعی اور حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد امام مجاہد علیہ الرحمۃ سے بڑا سخت قول منقول ہے: لا يَحِلُّ لِأَحَدٍ يُؤْمِنُ بِالله وَالْيَوْمِ الْأخِرِ أنْ يَّتَكَلَّمَ فِي كِتابِ اللهِ إِذَا لَمْ يَكُنْ عَالِماً بِلُغَاتِ الْعَرَبِ (الاتقان فی علوم القرآن، جز:۴، ص:۱۶۷) ''کسی ایسے آدمی کے لیے جو اللہ اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہو، اللہ کے کلام کے بارے میں کچھ بھی کہنا جائز نہیں ہے اگر وہ عربی زبان سے نابلد ہو۔ ایسا ہی قول امام دار الہجرۃ امام مالک علیہ الرحمۃ سے بھی منقول ہے: لا أُوْتِيَ بِرَجُلٍ غَيْرِ عَالِمٍ بِلُغَةِ الْعَرَبِ يُفَسِّرُ كِتَابَ اللهِ إِلّا جَعَلْتُهُ نَكَالًا (البرہان فی علوم القرآن، علامہ بدر الدین زرکشی، ج:۱، ص:۲۹۲) ''اگر میرے پاس کوئی ایسا آدمی لایا گیا جو عربی زبان سے ناواقف ہو اور وہ اللہ کی کتاب کے معنی بیان

کرتا ہو تو میں اسے لازماً نشانِ عبرت بنادوں گا۔

یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ مفسر کے لیے اتنی کڑی شرائط امت میں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔ اس بات کا ثبوت ان لوگوں کے اقوال و تحاریر سے خوب سامنے آچکا ہے جن کے سر علوم و مفاہیم قرآنیہ کی اشاعتِ عام کا سہرا سجتا ہے۔ اتنی کڑی شرائط کا مقصد جہاں قرآنِ پاک کو عوامی کھلواڑ سے بچانا اور دین کی اصل تعبیر کو محفوظ رکھنا ہے وہیں حضورِ پر نور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بیان کردہ وعید سے بچنا بھی ہے۔ اس وعید کا بیان شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی نے اپنے تحریر کردہ "آسان ترجمۂ قرآن" کے مقدمے میں فرمایا ہے۔ حضرت کی تحریر میں جہاں تہدید کا عنصر موجود ہے وہیں نصح و خیر خواہی کا بھی پورا جذبہ کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں: "غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعروادب میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہوجایا کرتے تھے، انھیں قرآنِ کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لیے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہوجائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآنِ کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لیے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لیے آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عربی زبان کی مہارت اور نزولِ وحی کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود "عالمِ قرآن" بننے کے لیے باقاعدہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی، تو نزولِ قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شدبد پیدا کرکے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسرِ قرآن بننے کا دعوی کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ: «مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ فِي النَّارِ» "جو شخص قرآن کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے" اور «مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ» "جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہہ دے تب بھی اس نے غلطی کی"۔ ابوداؤد و نسائی، از اتقان، ج:۲ ص:۱۷۹ (مقدمہ آسان ترجمہ قرآن ص:۳۲، ناشر: مکتبہ معارف القرآن کراچی، سن اشاعت: ۲۰۰۸ء) اسی

طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ: «أَيُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِي؟ وَأَيُّ أَرْضٍ تُقِلُّنِي؟ إِذَا قُلْتُ فِي كَلامِ اللهِ مَا لا أَعْلَمْ» (رواه ابن أبي شيبة والطبري) ”کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی اگر میں قرآن کے بارے میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں“۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ ساری احتیاطیں اور مذکورہ علوم کی تحصیل تو اس کے لیے ہیں جو تفسیرِ قرآن میں مشغول ہو، ہم تو درسِ قرآن کرتے ہیں تفسیر نہیں۔۔۔ چنانچہ جاننا چاہیے کہ تفسیر کسے کہتے ہیں، علامہ بدر الدین زرکشی علیہ الرحمۃ الاتقان فی علوم القرآن میں لکھتے ہیں: التفسيرُ عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهِ فَهْمُ كِتَابِ اللهِ الْمُنَزَّلِ عَلَى نَبِيِّهِ مُحَمَّدٍ ﷺ وبَيَانُ مَعَانِيْهِ وَاسْتِخْرَاجُ أَحْكَامِهِ وَحِكَمِهِ... ”علمِ تفسیر وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ کی کتاب (جو کہ اس کے نبی ﷺ پر نازل ہوئی) کا فہم، اس کے معانی کا بیان، استخراجِ احکام اور حکمتوں کا علم حاصل کیا جاتا ہے“۔ اب بتائیے کہ درسِ قرآن میں آپ کتاب اللہ کا فہم بیان کرتے ہیں کہ نہیں، اور احکام و مسائل اور ان کی حکمتیں اور لطیف نکتے بیان کرتے ہیں کہ نہیں؟ پھر آپ کیوں تفسیر اور درسِ قرآن میں فرق کرتے ہیں؟

دروسِ قرآن کی محافل کے انعقاد کے حوالے سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ کا یہ مشہور جملہ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے: ”بڑوں کو عوامی درسِ قران کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرانی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے“۔ (وحدتِ امت، مفتی محمد شفیع صاحب ص:۳۹)۔ یہ معلوم ہے کہ حضرت نے یہ جملے علمائے کرام کی ایک محفل میں ارشاد فرمائے تھے اور آپ کا روئے سخن بھی علما ہی کی طرف تھا۔ اس جملے کا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ ایک عام آدمی درسِ قرآن دینا شروع کر دے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ علما لوگوں کو قرآنِ مجید کا ترجمہ پڑھنے سے روکتے ہیں۔ یہ ایک سطحی سا اعتراض ہے۔ سوچنا چاہیے کہ جب علمائے کرام مقامی زبانوں میں تراجم کرتے ہیں تو ان کے پیشِ نظر علمائے کرام کو پڑھانا مقصود ہوتا ہے یا عوام کو؟ شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم آسان ترجمۂ قرآن کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ”مختلف اطراف سے احباب نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ اردو کے جو مستند ترجمے اس وقت موجود ہیں وہ عام مسلمانوں کی سمجھ سے بالاتر

ہوگئے ہیں، اور ایسے آسان ترجمے کی واقعی ضرورت ہے جو معمولی پڑھے لکھے افراد کی سمجھ میں بھی آسکے۔۔۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نام پر میں نے ترجمہ شروع کیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ خیال تھا کہ عام مسلمانوں کو قرآن کریم کا مطلب سمجھنے کے لیے ترجمے کے ساتھ مختصر تشریحات کی بھی ضرورت ہوگی، اس خیال کے پیش نظر میں نے ترجمے کے ساتھ مختصر تشریحی حواشی بھی لکھنے کا اہتمام کیا"۔(مقدمہ آسان ترجمۂ قرآن) یہ تو ایک نسبتاً جدید ترجمے کے مقدمے میں سے لیا گیا۔ اردو کے قدیم ترین ترجمہ 'موضح القرآن' کے مقدمے میں دیکھیں تو وہاں بھی آپ کو اس مفہوم کے الفاظ مل جائیں گے۔ اللہ سبحانہٗ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں درست انداز واسلوب میں قرآن کریم کی 'ایجابی و سَلبی' خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۴)

جنگِ موتہ اور اس کے بعد غزوۂ تبوک کی مہمات نے ہر طرف مسلمانوں کی دھاک بٹھادی۔ عرب کے وہ قبائل جو رومی سلطنت کے باج گزار تھے ان سے رومی رعب و دبدبہ ختم ہوا تو ان میں سے بعض نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صلح کی۔ مُعان کے علاقے میں فَروہ بن عَمرو الجُذامی روم کی طرف سے والی تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کیا۔ رومیوں کو پتا چلا تو انھوں نے فروہ سے جواب طلبی کی اور انھیں روم بلا کر پہلے تو قید کیا اور پھر شہید کر دیا۔ مسلمانوں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ رومی اس اقدام سے لوگوں کو خوفزدہ کر کے اسلام سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا ازالہ ضروری تھا ورنہ جنگِ موتہ اور غزوۂ تبوک سے پڑنے والا رعب و دبدبہ ختم ہونے کا اندیشہ تھا۔ ۱۰ ہجری میں نبی کریم ﷺ حج الوداع کے لیے تشریف لے گئے۔ حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد ۱۱ ہجری ماہِ صفر کے آخر میں نبی کریم ﷺ نے فوجی مہم شام کی طرف روانہ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ جنگ موتہ 'بلقاء' کے رومی گورنر کے ہاتھوں شہید ہونے والے سفیر سیدنا حارث بن عمیر الازدی رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لیے لڑی گئی تھی۔ اس میں شہید ہونے والے تین کمانڈروں میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ انھی کے صاحبزادے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو حضور کریم ﷺ نے اس آخری فوجی مہم کی سربراہی کے لیے منتخب کیا۔ اس تعیناتی میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے ساتھ گویا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے انتقام کی طرف اشارہ بھی پایا جاتا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس مہم کی امارت سونپتے ہوئے ارشاد

فرمایا:«سِرْ إِلَى مَوْضِعِ مَقْتَلِ أَبِيكَ فَأَوْطِئْهُمُ الْخَيْلَ فَقَدْ وَلَّيْتُكَ هَذَا الْجَيْشَ فَأَغِرْ صَبَاحًا عَلَى أَهْلِ أُبْنَى وَحَرِّقْ عَلَيْهِمْ وَأَسْرِعِ السَّيْرَ تَسْبِقُ الْأَخْبَارَ، فَإِنْ ظَفَّرَكَ اللهُ فَأَقْلِلِ اللُّبْثَ فِيهِمْ وَخُذْ مَعَكَ الْأَدِلَّاءَ وَقَدِّمِ الْعُيُونَ وَالطَّلَائِعَ أَمَامَكَ» ''اپنے باپ کی قتل گاہ کی طرف چلو اور اپنے گھوڑوں سے ان کی سرزمین کو روند ڈالو۔ میں تمھیں اس لشکر کا سالار بناتا ہوں، پس علی الصبح اُبنیٰ پر یلغار کرو اور ان پر آگ جلا دو، تم تیزی سے سفر طے کرو تاکہ خبر پہنچنے سے پہلے پہنچ جاؤ اور اگر اللہ تمھیں ان پر فتح دے تو وہاں تھوڑی دیر رکنا، اپنے ساتھ رہبر لے لو اور اپنے جاسوس اور سراغ رسانوں کو آگے روانہ کر دو''۔

سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی امارت کے بارے میں بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:«أَيُّهَا النَّاسُ فَمَا مَقَالَةٌ بَلَغَتْنِي عَنْ بَعْضِكُمْ فِي تَأْمِيرِي أُسَامَةَ وَلَئِنْ طَعَنْتُمْ فِي إِمَارَتِي أُسَامَةَ، لَقَدْ طَعَنْتُمْ فِي إِمَارَتِي أَبَاهُ مِنْ قَبْلِهِ، وَايْمُ اللهِ إِنْ كَانَ لَلْإِمَارَةِ لَخَلِيقًا وَإِنَّ ابْنَهُ مِنْ بَعْدِهِ لَخَلِيقٌ لِلْإِمَارَةِ وَإِنْ كَانَ لَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ، وَإِنَّهُمَا لَمَخِيلَانِ لِكُلِّ خَيْرٍ وَاسْتَوْصُوا بِهِ خَيْرًا فَإِنَّهُ مِنْ خِيَارِكُمْ» ''اے لوگو! اسامہ کو امیر بنانے کے بارے میں تم میں سے بعض لوگوں کی باتیں مجھ تک پہنچی ہیں، اگر تم اس کی امارت میں طعن کرتے ہو تو تم اس سے پہلے اس کے باپ کی امارت کے بارے میں بھی باتیں بنا چکے ہو، خدا کی قسم وہ بھی امارت کے لائق تھا اور اس کا بیٹا اسامہ بھی منصب امارت کا اہل ہے، اور وہ عام لوگوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے اور بے شک وہ دونوں اس لائق ہیں کہ ان سے ہر قسم کی نیک توقعات وابستہ کی جائیں۔ پس اے لوگو! تم اسامہ کے بارے میں مجھ سے اچھائی کی وصیت قبول کرو''۔

اپنی رحلت سے چند دن قبل رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے جھنڈا باندھ کر اسامہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا اور فرمایا: «أُغْزُ بِسْمِ اللهِ فِي سَبِيلِ اللهِ فَقَاتِلْ مَنْ كَفَرَ بِاللهِ» ''اللہ کے نام کے ساتھ، اس کے راستے میں جہاد پر نکلو اور ان سے لڑو جو اللہ کا کفر کرتے ہوں''۔ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا بریدة بن الحصيب الأسلمي کے حوالے کیا اور اپنی فوج کو لے جا کر جرف میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ کی فوج میں مہاجرین و انصار کے اکابر مثلاً سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر بن

الخطاب، سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح، سیدنا سعد بن ابي وقاص اور سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہم تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعد میں بھی حضرت اسامہ کو یاایھاالامیر کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

جن لوگوں نے سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کی مہم میں جانا تھا وہ رسول اللہ ﷺ سے مل کر الوداع ہونے لگے۔ جرف کے مقام پر آپ کا معسکر تھا لوگ وہاں جمع ہونے لگے جب آپ کو حضور ﷺ کی طبیعت کی خرابی کا علم ہوا تو وہیں رک گئے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مدینہ واپس ہو لیے۔ اتوار کے دن سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور آپ کا بوسہ لیا۔ حضور کریم ﷺ بات نہ کر سکے لیکن ہاتھ اٹھائے۔ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مجھے یقین ہے وہ میرے لیے دعا کر رہے تھے۔ اس کے بعد اسامہ اپنے معسکر میں آ گئے۔ پھر پیر والے دن سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ دوبارہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے آپ کو روانگی کا حکم دیا: «أُغْدُ عَلَى بَرَكَةِ اللهِ» ”اللہ کی برکت کی امید پر چلو“۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے معسکر میں تشریف لے گئے اور لشکر کو روانگی کا حکم دیا۔ جب روانگی کے لیے بالکل تیار ہو چکے تو رسول اللہ ﷺ کی رحلت کی خبر ملی۔ سیدنا اسامہ بن زید، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم مدینہ پہنچ آئے، جبکہ بعد میں اہلِ لشکر بھی مدینہ لوٹ آئے اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے اپنا جھنڈا حضور کریم ﷺ کے دروازے کے باہر ہی لگا دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی تدفین کے بعد جب سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو چکی تو انھوں نے حکم دیا کہ جیشِ اسامہ کو روانہ کر دیا جائے۔ لوگوں نے بہ اصرار رائے دی کہ جیشِ اسامہ کو روک لیں، اس لیے کہ مدینے کے اردگرد ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا ہے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے تھی۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس مہم کے جاری رکھنے کا عزم مصمم ظاہر کیا اور فرمایا: ”خدا کی قسم میں اس جھنڈے کی گرہ نہ کھولوں گا جو اللہ کے رسول ﷺ نے لگائی ہو۔ کیا تم لوگ مجھے رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے برعکس رائے دیتے ہو...“۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ جو لوگ رسول اللہ کی زندگی میں اس لشکر میں شامل تھے وہ سب کے سب نکلیں سوائے اس کے کہ آپ خود خلافت کی ذمے داری کی وجہ سے لشکر میں شامل نہ ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت انھوں نے امیر لشکر سے لے لی۔ حضرت ابو بکر

صدیق رضی اللہ عنہ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی باگ پکڑے دور تک گئے اور لشکر کو الوداع کیا۔

مشکل حالات میں جیشِ اسامہ کو روانہ کرنا ایک بہترین فیصلہ تھا۔ مسلمانوں کا لشکر جہاں سے گزرتا لوگ مرعوب ہوتے جاتے اور کہتے اگر مسلمان مضبوط و متحد نہ ہوتے اور ان کے پاس طاقت نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی روم کے مقابلے میں نہ نکلتے۔ آپ کا لشکر بیس دنوں میں اُبنیٰ پہنچا۔ یہاں جن لوگوں نے آپ کا مقابلہ کیا انھیں قتل کیا گیا اور ایک گروہ کو قیدی بنایا۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ان کے گھروں اور فصلوں کو جلا دیا۔ آپ کو بہت سارا مالِ غنیمت ملا جو آپ نے شرعی ضابطے کے مطابق تقسیم کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ وہاں ایک دن مقیم رہے اور پھر واپسی کی راہ لی اور راستے ہی سے مدینہ کی طرف اپنی فتح کی اطلاع روانہ کی۔ آپ کے لشکر کو کوئی جانی نقصان نہیں ہوا جبکہ مالِ غنیمت خوب حاصل ہوا۔ آپ مدینہ واپس آئے تو آپ کا شاندار استقبال ہوا۔ ہِرَقْل ان دنوں حِمص میں مقیم تھا۔ جب اسے جیشِ اسامہ کی کاروائی کی اطلاع ملی تو وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس نے بلقاء کے علاقے کے آس پاس فوجی پہرے کا انتظام کر دیا۔ (الطبقات الکبری)

نبی کریم ﷺ کی رحلت کے بعد بہت سارے قبائل اسلام سے منحرف ہو گئے، ان میں سے کچھ تو اسلام کے بعض احکام کے منکر تھے اور بعض تو بالکل اسلام ہی سے مرتد ہو کر جھوٹے مدعیان نبوت کے پیروکار بن گئے۔ ان میں بنو اسد، بنو غطفان، بنو تمیم، ہوازن، بنو قضاعہ، بنو حنیفہ، بنو سلیم وغیرہ شامل تھے۔ ان میں بعض قبائل بہت طاقتور ہو گئے تھے۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان تمام کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا۔ سنہ ۱۱ ہجری میں آپ انھی مرتدین و مانعین کی طرف متوجہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام محاذوں پر مسلمانوں کو کامیابی دی اور ہر طرح کی شورشوں اور بغاوتوں کا قلق قمع ہو گیا۔ ان جنگوں کے اہم کمانڈر حضرت خالد بن الولید، حضرت عِکرمہ بن ابی جہل، حضرت عمرو بن العاص، حضرت خالد بن سعید بن العاص، حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم اجمعین تھے۔ جزیرۃ العرب سے فراغت کے بعد، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ شام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے لیے آپ نے مکہ اور یمن وغیرہ کی طرف خط روانہ کیے، ان سب کا مضمون ایک ہی تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلامٌ عَلَيْكُمْ

أمّا بعْدُ! فإنّي أحْمَدُ اللهَ الّذي لا إلهَ إلّا هُوَ وَأُصَلّي عَلى نَبِيِّهِ مُحَمَّدٍﷺوقَدْ عَزَمْتُ أَنْ أُوَجِّهَكُم إلى بِلادِ الشّامِ لِتَأخُذُوهَا مِنْ أيْدي الْكُفَّارِ والطُّغَاةِ فَمَنْ عَوّلَ مِنْكُم عَلى الْجِهَادِ والصِّدَامِ فَلْيُبَادِرْ إلى طاعَةِ الْمَلِكِ الْعَلّام ﴿اِنْفِرُوا خِفَافاً وَثِقَالاً وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ ”اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے۔ تم سب پر سلامتی ہو۔ اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور میں درود و سلام بھیجتا ہوں نبی کریم ﷺ پر، اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ تم لوگوں کو شام کی طرف روانہ کروں تاکہ اسے کافروں اور سرکشوں سے چھین لو۔ پس تم میں سے جس کا جہاد اور کفار کے ساتھ تصادم کا ارادہ ہے تو اسے چاہیے کہ وہ بادشاہِ حقیقی کی اطاعت کرے (کہ وہ فرماتا ہے): نکلو چاہے ہلکے ہو یا بوجھل اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو“۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس دعوت کے لیے لوگوں کے دلوں میں قبولِ عام رکھ دیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو یمن کی طرف خط لے کر گئے تھے واپسی پر اپنی کارگزاری سناتے ہوئے کہتے ہیں: يا خليفةَ رسولِ اللهِ وحَقُّكَ علَى اللهِ مَا قَرَأْتُ كِتَابَكَ عَلى أَحَدٍ إلّا و بَادَرَ إلى طاعةِ اللهِ و رسولِهِ وأَجابَ دَعْوَتَكَ و قَدْ تَجَهَّزُوا ”اے جانشینِ رسول! اور اللہ کے ہاں آپ کا یہی مقام تھا کہ میں نے جس پر بھی آپ کا خط پڑھا وہ اللہ اور رسول کی اطاعت کی طرف دوڑ پڑا اور اس نے آپ کی دعوت قبول کی اور انھوں نے نکلنے کی تیاری شروع کردی“۔

چند ہی دنوں میں یمن اور اطراف کے مختلف قبائل کے دستے مدینہ پہنچنے لگے جنھیں مضافاتِ مدینہ میں ٹھہرایا گیا۔ جب ایک معقول تعداد جمع ہوگئی تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ معسکر کی طرف نکلے جب کہ حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت علی اور دیگر اصحاب رضی اللہ عنہم آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کو دیکھا تو خوشی سے آپ کا چہرہ کھلکھلا اٹھا اور آپ نے دعا کی: اَللّهم أَنْزِلْ عَليهِمُ الصّبْرَ وأَيِّدْهُمْ ولا تَسْلِمْهُمْ إلى عَدُوِّهِمْ إنَّكَ على

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (فتوح الشام) ''اے اللہ ان پر صبر نازل فرمااور ان کی مدد فرمااور انھیں دشمنوں کے حوالے مت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے''۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے متعدّد لشکر روانہ کیے۔ (باختلاف روایات) آپ نے سب سے پہلے حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو بلایا، جب وہ سامنے آگئے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے جھنڈا باندھ کر ان کے ہاتھ میں تھمایا اور حکم جاری کیا کہ میں ایک ہزار کے لشکر کا امیر آپ کو بناتا ہوں۔ پھر آپ نے حضرت ربیعہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انھیں ایک ہزار مجاہدین کے لشکر پر امیر بنایا۔ پھر آپ نے حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ کو حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں دیتے ہوئے تاکید کی کہ ان سے مشاورت کا اہتمام کیا جائے اور انھیں لشکر کے مقدمے میں رکھا جائے۔ حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو آپ نے حکم دیا کہ وہ تبوک کے راستے سے شام میں داخل ہو کر وسط شام دمشق تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ لشکر کو الوداع کرنے پاپیادہ ثَنِيَّةُ الْوَدَاعِ تک گئے اور انھیں نصیحتیں فرمائیں۔ ایک لشکر آپ نے سیدنا شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں تشکیل دیا جو پہلی فوج کے بعد شام کے لیے روانہ ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے بھی تبوک ہی کا راستہ تجویز فرمایا اور انھیں اردن تک پہنچنے کا حکم دیا۔ ایک لشکر کے امیر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بنائے گئے۔ اس لشکر میں مکہ اور طائف کے سارے سرکردہ لوگ شامل تھے۔ آپ نے سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ایک طویل نصیحت کی اور انھیں اَیلہ کے راستے فلسطین پہنچنے کا حکم دیا اور انھیں حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں دیا۔ ایک لشکر کے سپہ سالار سیدنا ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بنائے گئے۔ اس لشکر میں مہاجرین و انصار کی بڑی تعداد تھی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو کماندارِ اعلیٰ کی ذمے داری بھی دی کہ ویسے تو ہر امیر اپنے لشکر کی سربراہی کرے گا لیکن اگر کوئی فوج آپ کے ساتھ جمع ہوگی تو امیر حضرت ابو عبیدہ ہوں گے۔ خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ نے آپ کو جابیہ کی طرف سے حمص اور شمالی شام میں داخل ہونے کا حکم دیا اور ان سے کہا: اے امینِ امت! میں نے جو باتیں عمرو بن العاص سے کی ہیں وہ آپ بھی سن رہے تھے، ان باتوں کا خیال کیجیے۔

جیشِ سیدنا یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ

حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ تیزی سے سفر کریں۔ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ خلیفہ نے آپ کو فوجیوں پر نرمی کرنے کا کہا ہے اور فوجی سازو سامان کے ساتھ اتنا تیز سفر افواج کے لیے باعثِ مشقت ہے۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دیکھو خلیفہ ہمارے پیچھے مزید افواج روانہ کر رہے ہیں، میری خواہش ہے کہ شام میں سب سے پہلا میرا لشکر داخل ہو اور سب سے پہلے فتح بھی وہی حاصل کرے۔ اس پر دونوں کی رائے متفق ہوئی اور مسلمانوں کا لشکر تیزی سے سفر کرتے ہوئے تبوک جا پہنچا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے کچھ دن آرام کیا۔

قیصر کی سرگرمیاں

ظاہر ہے قیصر مسلمانوں پر ہر طرح سے نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے اطلاع مل گئی کہ مسلمانوں کے خلیفہ نے شام کی طرف لشکر بھیجے ہیں تو اس نے اپنے درباریوں، لاٹ پادریوں اور سپہ سالاروں کو جمع کر کے مشاورت کا اہتمام کیا۔ اس دوران اس نے مخبر سے مسلمانوں کے خلیفہ کا حلیہ معلوم کیا۔ یہ مخبر کپڑے کا تاجر بن کر مدینہ گیا تھا اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سے اپنے لیے کپڑا بھی خریدا تھا۔ جب حلیۂ مبارک قیصر کے سامنے آچکا تو اس نے اپنے مصاحبین سے کہا: ”خدا کی قسم یہ محمد کا وہی ساتھی ہے جس کا ذکر ہماری کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اور محمد وہی نبیٔ موعود ہیں جن کا وعدہ ہماری کتابوں میں پایا جاتا تھا، اور میں چاہتا تھا کہ تم سب اسلام قبول کر لو، وہ تو تم نے کیا نہیں، اب اس نبی کے جانشین تمھاری مملکت کو تباہ کرنے آپہنچے ہیں۔ میں تمھیں اسی دن سے ڈراتا تھا اور مسلمان ہو جانے کا نیک راستہ دکھاتا تھا لیکن تم نے میری نہیں مانی، اب بتاؤ تم کیا کرو گے ؟“۔ اس کے پادریوں اور دیگر لوگوں نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا اور مسلمانوں کا قلع قمع، مکہ و مدینہ کو تاراج بلکہ خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کے دعوے کرنا شروع کیے۔ قیصر نے کہا کہ اچھا اگر ایسا ہے تو پھر اپنے دین اور اپنے وطن کے لیے لڑو۔ قیصر نے بھی متعدّد لشکر روانہ کیے۔ اس نے اپنے ایک جرنیل کو لشکر دے کر فلسطین کی طرف جانے کا حکم دیا اور کہا: ”فلسطین ہمارے سر کا تاج اور ہماری جاہ و منزلت ہے، پس جاؤ اور اس کا دفاع کرو“۔ قیصر نے آٹھ ہزار سورماؤں کا انتخاب کیا اور ان پر پانچ لاٹ پادری امیر بنائے اور لشکر کو تبوک کی طرف روانہ کر دیا۔

روم کی ہزیمت

مسلمان تین دن پہلے تبوک پہنچ کر آرام فرما تھے۔ چوتھے دن مسلمان شام کی طرف چلنے کے لیے روانہ ہوئے تو کسی لشکر کے آثار نظر آنے لگے اور روم کا ایک لشکر جرار مسلمانوں کے مقابل آن اترا۔ حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے یہ تدبیر کی کہ حضرت ربیعہ رضِی اللہ عنہ کو ان کے لشکر کے ساتھ پیچھے بھیج کر چھپا دیا اور اپنی فوج کو لے کر قدرے آگئے اور اپنی فوج سے وعظ کیا: "کتنی ہی بار یہ ہوا کہ قلیل تعداد، اللہ کے حکم سے کثیر پر غالب آگئی اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور دیکھو تمھارے نبی نے فرمایا کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے اور تم پہلی فوج ہو جو شام میں داخل ہوئی ہو، تاکہ بنی اصفر کے خلاف جہاد کر سکو، تم یوں سمجھو کہ تم گویا شام ہی کی فوج ہو، اور دیکھو لالچ سے بچو ورنہ دشمن تمھارا لالچ کر لے گا (یعنی فتح پا لے گا) اور اللہ کی مدد (کا ارادہ) کرو اللہ تمھاری مدد کرے گا"۔ ان کے وعظ کے دوران ہی رومیوں کا لشکر نزدیک آگیا۔ انھوں نے جب مسلمانوں کی قلت کو دیکھا تو حملہ کرنے میں جلدی کی۔ مسلمانوں نے بہت ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مقابلہ جم گیا تو اچانک سیدنا ربیعہ بن عامر رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ کمین گاہوں سے کلمۂ طیبہ، تکبیر اور درود شریف کا ورد کرتے ہوئے نکلے اور ایسا زور دار حملہ کیا کہ رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ پیچھے بھاگنے لگے۔ رومیوں کا سپہ سالار اپنے فوجیوں کو جنگ پر ابھار رہا تھا، اتنے میں حضرت ربیعہ رضِی اللہ عنہ نے پہچان کر ایسا کاری وار کیا کہ کھیت رہا۔ رومیوں نے یہ ماجرا دیکھا تو ان کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ بھاگنے لگے، اس طرح اس لڑائی کا انجام مسلمانوں کی فتح پر ہوا۔ اس جنگ میں بارہ سو رومی واصلِ جہنم ہوئے جبکہ ایک سو بیس مسلمانوں نے جنت کی راہ پائی۔ کچھ دور جا کر رومی دوبارہ جمع ہوئے۔ اب انھوں نے قدرے عقل مندی کی اور مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ اپنے کسی سمجھدار آدمی کو بھیجیں تاکہ ہم اس سے بات کریں۔ ادھر سے حضرت ربیعہ بن عامر رضِی اللہ عنہ ہی گئے۔ رومیوں نے اپنے ایک پادری سے کہا کہ اس عربی سے اس کے نبی کے بارے میں بات کرو۔ پادری نے آخری نبی کی وہ نشانیاں اور اہم امور بتائے جو ان کی کتابوں میں منقول تھے۔ حضرت ربیعہ رضِی اللہ عنہ ان نشانیوں کی تصدیق میں آیاتِ قرآنی پڑھتے جاتے یہاں تک کہ اس پادری نے اپنے سالار کو بتایا کہ ان لوگوں کا نبی ہی وہ آخری نبی ہے جس کی نشانیاں ہمارے ہاں مذکور ہیں۔ اب رومی سالار

نے کچھ مال وغیرہ کے عوض یہ صلح کرنا چاہی کہ نہ تم ہم پر حملہ کرو اور نہ ہم تم پر حملہ کریں۔ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کیا اور مسلمانوں کا تین نکاتی لائحہ عمل پیش کیا کہ یا تو اسلام قبول کرو یا جزیہ ادا کرو یا پھر جنگ کی تیاری کرو۔ رومی سالار نے کہا کہ پہلے دو کا تو کوئی امکان نہیں تیسرے کے لیے ہم تیار ہیں۔ چنانچہ دونوں لشکروں میں ایک اور زبردست ٹکراؤ ہوا۔ خدا کی شان دیکھیے کہ عین معرکے کے دوران حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ اپنا لشکر لیے آن پہنچے اور معرکے میں شامل ہو گئے۔ رومی اس تازہ حملے کی تاب نہ لا سکے اور بھاری نقصان اٹھا کر بھاگ نکلے اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کو مالِ غنیمت دے کر مدینہ روانہ کیا۔ جب فتح کی خبر مدینہ پہنچی تو یہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور مدینے کے در و دیوار، نعرۂ تکبیر و تہلیل اور درود و سلام سے گونج اٹھے۔ (فتوح الشام للواقدی)

مسلمانوں کی شکست

تیماء وادی القری اور شام کے درمیان ایک علاقہ ہے جو سات ہجری میں مسلمانوں کے زیرِ تسلط آ چکا تھا۔ یہاں پر یہودیوں کی اکثریت تھی اور وہ مسلمانوں کے ذمی بن کر رہ رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو ایک فوج دے کر یہاں متعیّن کیا اور کہا کہ جب تک میرا اگلا حکم نہیں آتا آپ یہیں رکے رہیں اور اردگرد کے عرب لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہیں سوائے مرتدین کے، اور لڑائی نہ کریں جب تک کوئی آپ سے لڑائی نہ کرے۔ رومیوں نے لشکر ان کے مقابلے پر روانہ کیا۔ اس میں اکثریت ان عرب قبائل کے لوگوں کی تھی جو کسی وقت عیسائی ہو چکے تھے۔ رومیوں نے عرب عیسائی قبائل کو جمع کر کے ایک لشکر تیار کیا اور تیما کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے خلیفۃ المسلمین کو خط لکھ کر راہنمائی طلب کی تو حکم دیا گیا کہ آپ اپنی فوج کو آگے لے کر آئیں لیکن لڑائی میں پہل نہ کریں۔ آپ نے مزید آگے سفر کیا تو رومیوں کا ایک جرنیل 'ہامان' یا 'باہان' اپنے لشکر کے ساتھ آپ کا منتظر تھا، اس نے مسلمانوں کے لشکر پر حملہ کیا اور خوفناک لڑائی ہوئی جس میں مسلمانوں کو شکست اور بھاری جانی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلمانوں کا لشکر تتر بتر ہو گیا اور حضرت خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اور باقی کچھ لوگ بمشکل

جان بچا کر نکلے۔ ان کی یہ پسپائی الگ الگ ہوئی تھی۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ مدینہ کی طرف آرہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں ذی المروہ نامی جگہ پر ہی رکنے کا حکم دیا۔آپ کے لشکر میں سے جو لوگ جان بچا کر نکلے تھے وہ مسلمانوں کے دوسرے لشکروں سے مل گئے۔

قیصر کی طرف سے صلح کی خواہش

جن دنوں مسلمانوں کے متعدّد لشکر شام میں داخل ہوئے ان دنوں قیصر فلسطین میں تھا۔اس نے اپنے درباریوں سے مشاورت کی۔ ہِرَقْل مسلمانوں کا برحق ہونا جان چکا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ مسلمان اس پر غالب آجائیں گے۔ اس نے اپنے مصاحبین سے کہا کہ پورا شام گنوا دینے سے بہتر ہے کہ شام کی آدھی آمدن پر مسلمانوں سے صلح کر لی جائے لیکن اس کے جرنیلوں اور پادریوں نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم مسلمانوں سے مقابلہ کر کے انھیں اپنے ملک سے نکال دیں گے۔

مزید رومی لشکر میدان میں

اب قیصر نے متعدّد لشکر تشکیل دیے۔ اپنے سگے بھائی تذارق کو اس نے نوے ہزار کا لشکر دے کر سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا۔ جَرجہ کو اس نے ایک لشکر دے کر حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا۔ قَیقار کو ساٹھ ہزار کا لشکر دے کر سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا۔ ایک لشکر اس نے دَراقِص نامی جرنیل کو دے کر حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی طرف روانہ کیا۔ مسلمانوں نے باہمی مشاورت اور خلیفہ سے راہنمائی کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اپنی فوجوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ شام سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے انھوں نے یرموک کے مقام کا انتخاب کر کے مسلمانوں کو وہاں جمع ہونے کا حکم دیا۔ قیصر کو جب مسلمانوں کی نئی نقل و حرکت کی خبر ملی تو اس نے بھی اپنے لشکروں کو یرموک کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔ رومی لشکر کی تعداد کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔کم از کم تعداد والی روایت دو لاکھ چالیس ہزار کی ہے۔

جاری ہے

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

محفلِ میلاد کا انعقاد

سوال: السلام علیکم ! درج ذیل روایت کے بارے میں رہنمائی فرمائیں کیا یہ روایت صحیح ہے؟ کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے میلاد النبی منایا؟

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن صحابہ کرام جلسے کی صورت میں جمع تھے اور اور محفل منا رہے تھے، جس میں وہ اللہ کی حمد و ثنا اور نبی پاک ﷺ کی آمد کا تذکرہ کر رہے تھے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے، تو سرکار دوعالم ﷺ جب اس محفل میں تشریف لائے تو اس کو بہت پسند فرمایا اور بشارت دی کہ اس محفل کے بارے میں حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری اس محفل پر فرشتوں میں فخر فرما رہے ہیں۔ (سنن نسائی، مسند امام احمد بن حنبل واسنادہ صحیح)

جواب: رسول اللہ ﷺ کا ذکرِ خیر، ولادت، بعثت، دعوت، جہاد، معجزات غرضیکہ آپ کی جس صفت کا تذکرہ جس جہت سے کیا جائے باعث خیر و برکت اور باعث اجر و ثواب ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ذکرِ ولادت شریف نبوی ﷺ مثل دیگر اذکارِ خیر کے ثواب اور افضل ہے اگر بدعات اور قبائح سے خالی ہو، اس سے بہتر کیا ہے..... البتہ جیسا ہمارے زمانے میں قیودات و شنائع کے ساتھ مروّج ہے اس طرح بے شک بدعت ہے۔ (امداد الفتاوی، جلد پنجم، کتاب البدعات)

سنن نسائی کی روایت درج ذیل ہے:«قَالَ مُعَاوِيَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ خَرَجَ عَلَى حَلْقَةٍ يَعْنِي مِنْ أَصْحَابِهِ فَقَالَ: «مَا أَجْلَسَكُمْ؟» قَالُوا: جَلَسْنَا نَدْعُو اللهَ وَنَحْمَدُهُ عَلَى مَا هَدَانَا لِدِينِهِ، وَمَنَّ عَلَيْنَا بِكَ، قَالَ: «آللهُ مَا أَجْلَسَكُمْ إِلَّا ذَلِكَ؟» قَالُوا: آللهُ مَا أَجْلَسَنَا إِلَّا ذَلِكَ، قَالَ: «أَمَا إِنِّي لَمْ أَسْتَحْلِفْكُمْ تُهَمَةً لَكُمْ، وَإِنَّمَا أَتَانِي جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَأَخْبَرَنِي أَنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يُبَاهِي بِكُمُ الْمَلَائِكَةَ»(سنن النسائي، كتاب أدب القاضي، كيف يستحلف الحاكم)''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے ایک حلقے میں تشریف لائے اور فرمایا: آپ کو کس نے یہاں بٹھایا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: ہم بیٹھے ہیں تاکہ اللہ سے مانگیں، اور اس نے جو ہمیں دینِ اسلام کی ہدایت دی ہے، اور آپ (کو نبی رحمت بنا کر ہم میں بھیجا اور آپ) کے ذریعے ہم پر احسان کیا تو اس پر اس کی حمد و ثنا بیان کریں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: بخدا! آپ اسی وجہ سے بیٹھے ہیں؟ صحابہ کرام نے فرمایا: اللہ کی قسم! اسی بات نے ہمیں یہاں بٹھایا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے آپ سے قسم کسی تہمت کی وجہ سے نہیں لی بلکہ میرے پاس جبریل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور مجھے بتایا کہ اللہ رب العزت تمھاری وجہ سے فرشتوں پر فخر فرما رہے ہیں۔اس روایت سے شارحینِ حدیث نے مختلف فوائد اخذ کیے ہیں۔ جیسے صحیح مسلم کی شرح میں درج ذیل فوائد تحریر ہیں:

(۱) مساجد میں اللہ کے ذکر کی خاطر جمع ہونے کی فضیلت کا بیان۔ (۲) مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ اللہ نے اسے اسلام کی راہ دکھائی ہے اور یہ کہ اللہ نے اسے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی امت میں پیدا فرمایا۔ اس سے بڑھ کر قابل فخر اور کچھ نہیں۔ (۳) اللہ رب العزت نیک بندوں پر فرشتوں میں فخر فرماتے ہیں.....''۔

لیکن سوال میں مذکور روایت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے میلاد النبی منانے پر کسی نے استدلال نہیں کیا۔ بلکہ سائل نے ترجمے میں ایک جملہ اپنی طرف سے اضافہ کیا کہ صحابہ کرام محفل منا رہے تھے۔ اس جملے کو درمیان سے نکال دیا جائے تو مذکورہ روایت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے میلاد النبی منانے پر استدلال کرنا درست نہیں رہے گا۔

****

محمد حسین آزاد (۱۸۳۰۔۱۹۱۰)

معروف اردو ادیب، شاعر، اردو کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بد نصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔ ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالا تر لے گیا ہے۔ وہ کہتا کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا، اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطانِ افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہا، دبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا، اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک

پہنے تھا۔ جس کا دامن دامنِ قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنات کی تصویریں زر دوزی کڑھی ہوئی تھیں۔ اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وہ غریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں، اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی، اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقامِ مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتا دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پرانے سے چکن کے چغے میں ایک بھاری سی گٹھری لے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا، بدن سے پسینہ بہتا تھا، اور مارے بوجھ کے ہانپتا جاتا تھا، اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دودِ آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انھی میں آہوں کے تیرِ خیالی اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہوسکا کہ ان بوجھوں کو سر سے، پھینک دیں۔ کچھ جدو جہد سے سر ہلایا۔ مگر جس طرح لدے ہوئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت کچھ موٹے موٹے ہونٹ۔ اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی مگر مجھے یہ ہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے۔ مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے۔ اور آدم زاد کے انبار رنج والم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع واقسام کے سقیم اور امراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہموں نے خواہ مخواہ انھیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا

جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں ان سب کا مجموعہ تھا۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض نوجوانی ہاتھوں میں لیے آتے تھے۔ مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا، اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بیوقوفی یا بد اطواری پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوسہائے نفسانی اور ضعفِ جسمانی اور عیوبِ عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پرواہ چلا آتا ہے۔ اس نے بھی ایک گٹھری پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شُہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے، مگر انھوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا۔ مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ بر خلاف اس کے بدن اور قد و قامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا، اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا، یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہِ پر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالمِ ہیولائی کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے۔ اب سلطانِ افلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج وتکلیف تبدیل کر لیں، اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور پھر بڑی ترت پھرت کے ساتھ اس انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز محترم معلوم ہوتا تھا۔ دردِ قولنج سے جاں بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و

املاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا اس نے دردِ مذکور کو پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑلی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ دردِ قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا دردِ قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا۔

ایک بچارہ جہازی غلام تھا کہ اس نے قیدِ زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑ کر بسور رہا ہے۔

غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی حالت میں گرفتار تھے، اور اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لیا تھا، وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اسے چھوڑا تھا۔ اب وہ دردِ جگر کا مارا لوٹ رہا تھا اور اسی طرح بر عکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی حاصل ہوئی تھی۔

عورتیں بچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا۔ مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دبلے تھے، اس لیے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بارودوں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں۔ وہ حقیقت میں ہمارے سہارنے کے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

مجھے اس بڈھے کے حال پر نہایت افسوس ہوا کہ ایک خوبصورت سجیلا جوان بن کر چلا۔ مگر مثانے میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑی ٹیکتا گرتا

پڑتا چلا جاتا تھا۔ کمر جھکی ہوئی۔ گردن بیٹھی ہوئی تھی۔ مونڈھے کھوئے ہوئے سر سے اونچے نکل آئے تھے اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں ان کا غول گرد تھا۔ یہ انھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف نہ گزرنا چاہیے، چنانچہ اس کی صورتِ حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا۔ مگر میں بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا۔ مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی۔ کیوں کہ جب میں اپنی پیشانی سے عرق ندامت پوچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا، چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس ہی دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا۔ اس نے ایک لم ٹنگو سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے، سر کا یہ عالم تھا گویا ہوا میں اڑا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھینچے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالت غریب کو دیکھ کر کہا کہ میاں اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سو دامڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا۔ مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری نالہ و فریاد آہ و افسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطانِ افلاک کو بیکس آدم زاد کے حالِ دردناک پر رحم آیا، اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سرو گردن میں سے اتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس کی جگہ ایک فرشتۂ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات و سکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوش نما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمتِ الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اسی کی آس پر لگا دیا۔ اس کا نام

صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اس کوہِ مصیبت کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا جو کوہِ مذکور خود بخود سمٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثُلُث رہ گیا۔ پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبارِ لاانتہا میں سے اپنا بارِ مصیبت چننا نہ پڑا۔

(نیرنگِ خیال، حصۂ اول از محمد حسین آزاد، ص:۵۷)

*****